Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دو ہفتے ہو گئے ہیں کوئی کام کا گانا نہیں سُنا۔ دِن رات یہی ہُو ہا لگی رہتی ہے۔"

"تُو کانوں پر چادر لپیٹ کر سو جا،" سرفراز نے کہا، "بھینس کے آگے بین بجانے کا کیا فائیدہ۔"

"ٹر ٹر نہ کر، ابھی تجھے بتاتا ہُوں بھینس ہوں کہ بھینسا۔"

"اوئے واہ، اُٹھنے کی تیرے اَندر ہمّت نہیں اَور باتیں بڑھ بڑھ کے کرتا ہے۔"

"پینڈو وَ، جوتے تو اُتار کر سوَ۔" احمد شاہ بیچ میں بولا۔

"یار کیا بکواس لگا رکھی ہے،" سلیم نے تنگ آکر کہا۔ "چُپ کرو، تمہاری ہر وقت کی تُو تُو مَیں مَیں کان کھا گئی ہے۔ شاہ، یار ریڈوئے کی آواز نیچی کر دے، اِن دونوں کو صبر آجائے۔"

"ہاں بھئی، آئن سٹائن صاحب کو سوچ بچار کی مُہلت چاہئے۔" سرفراز نے کہا۔

"شاہ جی، آئن سٹائن فزکس کا معمہ حل کر رہا ہے،" غلام حسین بولا۔ "دو سال ہو گئے ہیں، ابھی شُروع میں ہی اٹکا ہُوا ہے۔"

اب وہ دونوں اَپنی لڑائی چھوڑ کر سلیم کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ احمد شاہ نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو کی آواز کم کر دی۔

"ایک سگریٹ تو دو شاہ جی،" غلام حسین نے کہا۔

احمد شاہ نے ڈبی سے سگریٹ نکال کر سلگایا اَور غلام حسین کی جانب اُچھال دیا۔ غلام حسین نے جلتا ہُوا سگریٹ ہاتھوں کے پیالے میں پکڑا اَور تیزی سے اُٹھا کر اُنگلیوں میں دبوچ لیا۔ پھر بھی اُس کی ہتھیلی میں ایک جگہ پہ جلن اُٹھ گئی جِسے وہ تکئے پہ رگڑ کر سہلانے لگا۔ احمد شاہ نے اَپنے لِئے دُوسرا سگریٹ سلگایا اَور کش لینے لگا۔ کمرے میں اب خاموشی تھی۔ کچھ دیر کے بعد غلام حسین نے کہا۔

"ایک بات ہے شاہ جی۔ دال تھی بڑی مزیدار۔"

"مجھے تو اُس کی اوجھری پسند ہے۔" احمد شاہ نے کہا۔

"روٹیاں واقعی مفت دیتا ہے؟"

"ہاں۔ پہلے تین آنے کی دال اَور آنے کی روٹی دیتا تھا۔ پھر دال چار آنے کی کر دی اَور روٹیاں مفت، جتنی بھی کھالو۔ وَیسے دو سے تین کھالو تو مذاق مذاق میں کہہ جاتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے، لگتا ہے باؤ جی بُھوک رکھ کر نہیں کھاتے۔"

غلام حسین ہنسا۔

"ساتھ ہی اُس نے اوجھری بھی شرُوع کر دی،" احمد شاہ نے بات جاری رکھی، "مفت روٹیوں کے لالچ میں لوگوں نے دو دو سالن کھانے شرُوع کر دیئے۔"

"ہوشیار آدمی ہے،" غلام حسین نے کہا۔

سلیم دیوار کی طرف مُنہ کئے لیٹا خراٹے لینے لگا تھا۔ احمد شاہ اَور غلام حسین نے سگریٹ ختم کر کے فرش پر بجھائے تو احمد شاہ نے بجلی بجھا دی۔ ساتھ ہی ریڈیو بند کر دیا۔ اب کمرے میں تاریکی تھی۔ شام گو خُوش وقتی پہ ختم ہُوئی تھی مگر مستقبل کے بارے میں بے یقینی کی کیفیت سب پہ طاری تھی۔ ہندوستان کی دُشمنی اَور اُس کے روبرو مزاحمت کے جذبات دِلوں میں موجزن تھے۔ آخر اعصاب کی تھکاوٹ اُن پہ غالب آگئی اَور نیند نے اُنہیں پناہ میں لے لیا۔۔۔ سوائے ایک سرفراز کے۔

سرفراز کی آنکھیں یُوں وا تھیں جیسے کہ اُنھوں نے نیند کا مزا کبھی چکھا ہی نہ ہو۔ شرُوع شام سے اُس کے دِل میں ایک نامعلُوم سے غصّے کا اُبال تھا جو تھوڑی دیر کے بعد سَر اُٹھاتا اَور پھِر دب جاتا تھا۔ اب تاریکی ہونے پہ وہ رُوپوش لاوا تمتا رہ گیا تھا اَور بجھائے نہ بیٹھتا تھا۔ خُشک آنکھوں کے عقب میں صِرف دو عکس تھے۔ جنگ، اَور اوجھری۔

جب اُس نے دیکھا کہ سب سو چکے ہیَں اَور خراٹوں کی آوازیں تینوں جانب سے پیدا ہو رہی ہیَں تو سرفراز نے حسب عادت اَپنے اَندر ہی اَندر بولنا شرُوع کر دیا:

دو چار ماہ کی بات نہیں، دو چار برس کا قِصّہ ہے، مگر یُوں جیسے ایک ہی وقت میں، ایک ساتھ میرے سامنے کھڑا ہے۔ مجُھے اِس کی ایک ایک بات دِکھائی دے رہی ہے۔ اُس رات کو جب اوجھری پکی تھی اَور لالے نے اچار کی مدد سے روٹی کھائی تھی تو ایک لمبے عرصے کے بعد مَیں نے آخر لالے کو بی بی کے ساتھ لیٹے ہُوئے دیکھا تھا۔ آدھی رات کے وقت میری آنکھ کھُل گئی تھی۔ آسمان پہ ٹیٹری بولتی ہی جارہی تھی۔ لالے کا بستر خالی تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے آنکھیں مِل کر دیکھا تو لالہ بی بی کے بستر پہ لیٹا تھا اَور اُس میں ہلکی سی جنبش تھی۔ مُجھے پتا چل گیا کہ دونوں جاگ رہے ہیں۔ مَیں اُس وقت آدھی نیند میں تھا مگر مُجھے یاد ہے کہ مَیں دونوں کو ساتھ ساتھ لیٹا ہُوا دیکھ کر خُوش ہو گیا تھا، کیونکہ کافی عرصہ پہلے مُجھے کُچھ ایسا فہم ہوا تھا کہ بی بی اَور لالے کو کُچھ ہو گیا ہے۔ لالہ سارا سارا دِن باہر پھرتا رہتا تھا اَور بی بی نے بچونگڑوں کو کوسنا اَور مارنا شُروع کر دیا تھا۔ جب بی بی اُن کو مارتی تھی تو مَیں اُنہیں باہر لے جاتا تھا۔ بچونگڑوں کو وقت بے وقت رونے کی عادت پڑ گئی تھی جِس روز بی بی اوجھری پکاتی تھی لالہ مُنہ بنا کر اُٹھ جاتا تھا۔ پِھر کبھی کبھی وہ دُودھ کا کٹورہ پی لیا کرتا، ورنہ کھائے پیئے بغیر بستر پہ لیٹ کر سو جایا کرتا تھا۔ بی بی نے اُس کا دھیان کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اُس شام کو لالے نے مُنہ تو بنایا مگر اُٹھ کر نہیں گیا، روٹی ختم کر کے پیڑھی پہ بیٹھا بی بی کو دیکھتا رہا تھا۔ مَیں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو صحن میں رُک کر اُس نے ایک بچونگڑے کو پیار سے ہاتھ لگایا تھا۔ اگلے روز بھی جب وہ سویر کا نِکلا سہ پہر کو گھر آیا تو اُس کا رنگ زرد تھا اَور کپڑے پسینے سے بھیگے ہُوئے تھے، مگر اُس کے چہرے پہ ایک عجیب خالی خالی سا اطمینان تھا اَور مزاج کھُلا ہُوا تھا۔ لالہ دونوں بچونگڑوں کو گود میں لے کر دیر تک اُن کے ساتھ کھیلتا رہا تھا۔ اُس روز کے بعد لالے نے گھر سے غائب رہنا چھوڑ دیا اَور زمین پہ دھیان دینا شُروع کر دیا تھا۔ سال کے گزُرنے کا پتا بھی نہ چلا تھا۔ اُس سال کی ہر ایک چھوٹی چھوٹی بات مُجھے یاد ہے، مگر یُوں لگتا ہے کہ اُس عرصے میں دو ہی بڑے واقعات ہُوئے تھے۔ میں نے آٹھویں جماعت کا وظیفے کا اِمتحان دیا تھا۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر کو میری پڑھائی پر بڑا مان تھا۔ اُس نے خُود مُجھ سے کہا تھا کہ وظیفہ لگ گیا تو سکُول کا نام بن جائے گا۔ لالے نے تین مہینے تک مُجھے سارے مضمونوں کی تیاری کرائی تھی۔ بی بی نے کہا نماز پڑھ کر دُعا مانگا کرو۔ مَیں روز رات کو کھانے کے بعد مسجد میں جانے اَور نماز ادا کرنے لگا تھا۔ وُضو کرنے پر مُجھے اَپنے بدن میں عجیب سی یک جہتی کا احساس ہوتا جیسے جِسم کے پُرزے ڈِھیلے ڈھالے، کھڑکھڑاتے ہُوئے حصے ایک دُوسرے سے جوڑ کر خُوب کس دیئے گئے ہُوں۔ نماز پڑھنے کے بعد میں گڑگڑا کر دُعا مانگتا اَور گڑگڑانے کے دوران چہرے پر روتی ہُوئی شکل پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔ یا اللہ، مَیں دِل میں پُکارتا، اگر میرا وظیفہ لگ جائے تو مَیں وعدہ کرتا ہُوں کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لِئے تیری مسجدوں میں نماز باجماعت ادا کرتا اَور تیری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عبادت کرتا رہوں گا۔ دُعا مانگنے کے دُوران اللہ میاں کی لمبی سفید ڈاڑھی والی شکل میری آنکھوں کے سامنے رہتی جس میں وہ سَر پہ بڑی سی سفید پگڑی باندھے، آسمان کے وسط میں اپنا چہرہ زمین کی جانب جُھکائے میرے ہر قول اَور فعل کو تاک رہے ہوتے تھے۔ پڑھائی میں سخت محنت اَور لمبے لمبے سبق یاد کرنے کے باوجُود دِل میں ایک بے یقینی سی رہتی تھی۔ مگر گڑگڑا کر دُعا مانگنے کے بعد دِل پہ اطمینان کا پردہ چھا جاتا تھا۔ مَیں مسجد سے لَوٹتا تو بی بی کہتی، "اللہ تیرے لالے کو بھی ہدایت دے۔ اِس نے تو کبھی مسجد کی شکل ہی نہیں دیکھی۔" بی بی سچ کہتی تھی۔ لالے نے میری ہوش میں کبھی نماز نہ پڑھی تھی، سوائے نماز جنازہ کے، جو کھڑے کھڑے ہی پڑھ لی جاتی تھی۔ کئی جنازوں پر مَیں لالے کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ اِسی طرح میں نے نہ کبھی ابے کو اَور نہ چاچے کو نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ بی بی کی بات سُن کر لالہ ہنس دیتا۔ "میں اللہ کے بندوں کی مدد کرتا ہُوں،" وہ کہتا۔ "یہ بھی ثواب کا کام ہے۔" لالہ بھی سچ کہتا تھا۔ اُسے مَیں نے کبھی کِسی چھوٹے بڑے شخص کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہُوئے نہ دیکھا تھا۔ جب زمین ٹھیکے پہ تھی تو ٹھیکے والے اَپنے دُکھڑے سُنا کر ٹھیکہ کم کرا لیتے تھے، جب کچھ دیر کے لِئے آدھے پر مزارعوں کے حوالے کی تو اُن کی تنگ دستی کی داستانیں سُن کر لالہ آدھی سے زیادہ جنس اُنہیں چھوڑ دیتا تھا۔ بی بی اُس سے جھگڑتی تھی اَور زمین اُس سے لے کر چاچے کے ہاتھ میں دینے کی دھمکیاں دیتی رہتی تھی۔ لالہ ہر دلعزیز تھا۔ اگر وہ کِسی شہر کے سکُول میں ہوتا تو اُس کے جانے پر ہڑتال ہو جاتی مگر گاؤں پھر گاؤں ہوتا ہے۔

وظیفے کے اِمتحان سے پہلے مَیں بابے چلّے شاہ کے مزار پر گیا جو ہمارے گاؤں سے آدھے کوس کے فاصلے پر تھا۔ مزار کی دیواریں سنگ مرمر کے سے سفید پتھر کی تھیں جن پر لوگوں نے اَپنی منتیں لکھ لکھ کر اُنہیں بھر دیا ہُوا تھا۔ مَیں نے بھی ایک کونے میں خالی جگہ ڈُھونڈ کر موٹے سکے والی کالی پنسل سے اَپنی منت کی تحریر لکھی: بابا جی، آپ کی دُعا سے میرا وظیفہ لگ گیا تو مَیں اَپنے پہلے وظیفے کی رقم سے آپ کی خدمت میں پانچ روپے کا چڑھاوا پیش کرُوں گا۔ سکُول سے چھُٹی ہونے پر سیدھا گھر آنے کی بجائے میں ہر روز مزار سے ہو کر اَور اَپنی لکھی ہُوئی منت کو پڑھ کر آتا، جِس سے میرے دل کو تسلی ہوتی تھی۔ اِمتحان شہر کے ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی سکُول میں منعقد ہوا تھا۔ مَیں نے پُورے پُورے پرچے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حل کئے اَور گھر آنے پر لالے نے دوبارہ مجھ سے حل کروائے۔ آخری پرچے کے دِن لالے نے اعلان کر دیا کہ بس، سمجھو کہ اللہ کے فضل سے وظیفہ مِل گیا۔ نتیجہ نِکلا تو میرا وظیفہ دو نمبروں سے رہ گیا۔ نتیجہ سننے کے بعد مَیں گھر سے نِکل کر اَپنی زمین کو چلا گیا اَور ایک کھیت کے کنارے دیر تک بیٹھا رہا تھا۔ میرے دِل پر غم کا بوجھ تھا۔ جب شام پڑ گئی تو لالہ مجھے ڈھونڈتا ہُوا وہاں آ نِکلا اَور مجھے اُٹھا کر واپس لے گیا۔

"واہ بھئی واہ، وہ میری سُرخ آنکھوں کو دیکھ کر بولا، "جوان آدمی ہو، رونے کی کیا بات ہے۔ اب میٹرک کی تیاری کرو،" وہ ہنسا۔ "وظیفے کی رقم بھی زیادہ ہوگی۔" مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولا، "تیری تو ساری عُمر پڑی ہے، تجھے پتا ہے۔" وہ چلتا چلتا رُک گیا اَور میری ٹھوڑی کو ہاتھ سے اُٹھا کر بولا، "تیری عُمر پاکستان جتنی ہے۔ جب تک پاکستان رہے گا، تُو بھی جوان رہے گا۔"

"ابا تو مجھے تھن ٹُٹ کہا کرتا تھا،" مَیں نے اُس سے کہا۔

"ابے کی کیا بات ہے،" لالہ ہنس کر بولا، "تو ابے کو نہیں جانتا۔ وہ مذاق کیا کرتا تھا۔"

لالے کے ساتھ گھر جاتے ہُوئے میرے دِل کو کچھ تسلی ہُوئی، مگر اُس دِن کے بعد نہ مَیں بابے چلے کے مزار پر گیا اَور نہ ہی مَیں نے مسجد کا رُخ کیا، بی بی کہتی، "تھ تھ تھ، اللہ میاں کو وظیفہ لگنے کی رشوت دیتے تھے؟ ایسی نمازیں قبول نہیں ہوتیں۔"

لالہ ہنس کر کہتا، "چھوڑ اِس کا پیچھا، محنت کرنے دے، نمازوں سے کیا ہوتا ہے۔"

"ہائے کفر کا بول مت بول،" بی بی جواب دیتی۔ "خُدا سے ڈر۔"

مجھے حیرت ہوا کرتی تھی کہ بی بی خود تو کبھی نماز نہیں پڑھتی مگر دُوسروں کو تلقین کرتی رہتی ہے۔ ایک بار مَیں نے پُوچھا تھا۔ "بی بی، تُم نماز کیوں نہیں پڑھتیں،" تو پہلے پشیمان اَور پھر غمزدہ سی ہو کر بولی تھی، "ہم کس گنتی میں ہیں۔ اللہ ہمیں بخش دے گا۔"

گاؤں میں صِرف چند ایک بہت بُوڑھے یا وہ غریب بچّے جن کے والدین نے اُنہیں مسجد میں داخل کرا دیا تھا، نماز پڑھا کرتے تھے۔ باقی کے لوگوں کو اَپنی اَور زمین اَور آسمان کی باہمی چپقلشوں سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔ کچھ دیر کے بعد بات گئی گزری ہو گئی۔ مَیں نے پھر سے پڑھائی کی محنت شُروع کر دی۔ میرا حوصلہ نہ ٹُوٹا، گو بچپن کے تیقن کی وہ کیفیت پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لَوٹ کر نہ آئی۔ میرا دِل ڈگمگا گیا تھا۔

لالے نے آٹھ ایکڑ زمین تیار کر کے اَپنے ہاتھ سے کماد کی فصل بوئی، جِس میں مَیں نے بھی برابر کا ہاتھ بٹایا۔ یہ اُس سال کا دُوسرا بڑا واقعہ تھا۔ کچھ زمین ہماری محنت سے لائق ہوئی، کچھ آسمان اُس سال مہربان رہا، پھر چاچے احمد نے ایک نمبر کے گاڑھے رس والے دیسی کماد کا بیج حاصل کرنے میں مدد کی، فصل ایسی گھنی چڑھی کہ سُورج کی روشنی زمین پہ نہ پڑتی تھی اَور کھیت میں ایک قدم چلنا دُشوار تھا۔ دُوسرے گاؤں کے زمیندار اُس آٹھ ایکڑ کماد کے پھل کو دیکھنے کے لِئے آتے تھے۔ ایک ایک گنا پونے کے مقابلے کا موٹا اَور بانس کی مانِند اُونچا اَور وزن میں دونوں سے بھاری تھا۔ چُوسنے پر اُس کے رس سے شہد ٹپکتی تھی۔ گاؤں کے لڑکے ایک سِرے سے داخل ہو کر دُوسرے سِرے تک دَوڑ کے مقابلے کی شرطیں لگاتے تھے، اَور جب دُوسری جانب نمودار ہوتے تو چھُری کی دھار کی مانِند تیز پتوں کے چیر اُن کے چہروں اور ہاتھوں کو لہولہان کئے ہوتے تھے۔ لالے کو جب پتا چلا کہ اِس کھیل سے فصل کا نقصان ہو رہا ہے تو اُس نے اُنہیں سختی سے منع کر دیا۔ اُنہی دنوں ملک جہانگیر کی شوگر مِل کا ایک کرشر چالُو ہو گیا۔ اُس مِل میں ملک جہانگیر کا تیسرا حِصّہ تھا جِس کے پیسے اُس نے ایک مُربع بیچ کر ادا کئے تھے۔

"اِنڈسٹری،" ملک جہانگیر نے اُنگلی اُٹھا کر کہا تھا جب مَیں بھی لالے کے ساتھ اُس سے ملنے کے لِئے گیا تھا۔ "اب ہماری نجات اِنڈسٹری میں ہے۔ اعجاز۔ ایوب خان کا ذہن انڈسٹری کی طرف ہے۔ کیا خبر کہ کل کو یہ زمینداروں کے ساتھ کیا کرے۔ خود یہ ہری پُور کا رسالدار یا رسالدار کا بیٹا یا جو کچھ بھی ہے، زمینداری سے اِس کا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ ہر طرف اصلاحات کا شور مچا ہُوا ہے۔ نہ جانے کِس وقت یہ مارشل لاء کے زور پہ زمینداریوں کا پتا ہی صاف کر دے۔ اِسی لِئے بھائی، ابھی سے دُور اندیشی کرنی پڑے گی۔ جدھر کی ہوا چلے اُدھر کو ہی مُنہ کر لو، فاصلہ جلدی طے ہوتا ہے۔ کیوں، کیا غلط کہتا ہُوں؟"

"بالکل نہیں،" لالے نے جواب دیا۔ "بڑی پتے کی بات ہے۔ دُنیا میں آج کل صنعتی دَور ہے۔"

"تُم تو پڑھے لکھے آدمی ہو، اِسی واسطے تُمہارے سامنے کھُل کر بات کرتا ہوں۔ ہمارا اپنا طبقہ بھی کوئی فرشتوں کی نسل سے نہیں ہے۔ لکیر کے فقیر ہیں۔ گلے کا کُرتہ پھٹا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھٹ جائے مگر قدم برابر زمین ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ جب مَیں نے مربعہ بیچا تو تُو جانتا ہے اَپنی ہی برادری نے میری کتنی بدنامی کی تھی، مگر دو سال میں مَیں دو مربعے اَور خرید لوں گا تو پھر ان کی شکل دیکھنے والی ہوگی۔ آنکھیں کُھلی رہ جائیں گی۔"

"دُرست کہا، ملک جہانگیر،" لالے نے کہا، "اِنگلینڈ اَور امریکہ میں جب صنعتوں کا دَور دَورہ ہوا تو اِس کے بعد وہ ساری دُنیا کے لیڈر بن گئے تھے۔"

"واہ بھئی اعجاز، تیرے ساتھ بات کرکے مزا آجاتا ہے۔ سویرے سے شام تک اَن پڑھ کِسانوں کے ساتھ دماغ کھپا کھپا کے میرا تو دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ مگر اب میری بات کو غور سے سُن۔ تیرا دماغ تو صنعت کی بات تک خُوب جاتا ہے• مگر میری دُور اندیشی آگے تک پہنچتی ہے۔"

"آپ کی دُور اندیشی کی کیا بات ہے، بھائی جہانگیر،" لالے نے کہا۔

"بھائی ای ای۔۔۔" ملک جہانگیر سمجھانے کے اَنداز میں بولا۔ "صنعتیں لگانا کوئی آسان کام نہیں۔ ان کی مشکلات بھی ساتھ ہی ہوتی ہیں۔ اب کی کمین مزارعے ملا جلا کر دو ڈھائی سو جانیں میرے رزق پر پلتی ہیں۔ اِن میں سے ایک کی بھی مجال نہیں کہ میری بات کے آگے اُونچ نیچ کرے۔ مگر مِل میں یہ بات نہیں ہوتی۔ کوئی مزدُور ہو یا کاریگر، یہ کِسی کی رعایا نہیں ہوتے۔ آٹھ گھنٹے کام کیا اَور گھر کی راہ لی۔ بیگار کا تو تصور ہی نہ کرو۔ اوورٹائم کی تکرار، تنخواہ کا تقاضا، پھر حکومت کی طرف سے سہولتیں، سال کے بعد چھٹیاں، بیماری کی چھٹیاں، ڈِسپنسری بناؤ، ریسٹ رُوم بناؤ، یہ بناؤ، وہ بناؤ، کوئی تھوڑے بکھیڑے ہیں؟ ابھی فیکٹری چالُو نہیں ہُوئی اَور یونین بنانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ باہر سے شرپسند لوگ آکر لیڈر بن جاتے ہیں۔ سمجھ گئے ناء؟"

"ہاں،" لالہ بولا، "یہ باتیں تو ساتھ چلتی ہی ہیں۔ زمین کی بادشاہت کہاں ملتی ہے؟"

"تُم نہیں سمجھے کہ مَیں کیا کہہ رہا ہُوں۔" ملک جہانگیر بولا۔ "یہ لیبر یونین کا قِصّہ ہے بھائی۔ تُمہیں تو یونین وونین کے قصوں کا اچھی طرح عِلم ہے، تجربہ بھی ہے۔ اِسی کام میں تُم نے مار کھائی ہے۔ اب اِس تعلق واسطے کو کام میں لانے کا وقت ہے۔"

لالہ خاموشی سے جہانگیر کو دیکھتا رہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کہنے کا مقصد یہ ہے بھائی اعجاز کہ لیبر کے معاملے میں تمہارا اثر رسوخ ہمارے کام آسکتا ہے۔ میں نے اپنے حصہ داروں کو تسلی دے دی ہے۔ تمہیں پتا ہے شیخوپورہ کے اعوان ہیں، اپنی برادری ہے، میں غیروں سے بھائی چارے کا روادار نہیں، کاروبار کا معاملہ ہے، سو باتیں ہوتی ہیں۔ ہمارا سب سے پہلے یہ فرض بنتا ہے کہ اپنے لوگوں کو جوڑ کر رکھیں۔ ایک وقت میں ملک حمید تمہارے اوپر ہاتھ ڈالنے کو پھرتا تھا۔ میں نے اس سے کہلوا دیا، ناں ناں، باہر آجا، ہمارے گھرانے اٹھ کھڑے ہوئے تو میں ان سے الگ ہو کر نہیں چل سکتا۔ تو بھائی اعجاز، ایک دوسرے کی مدد امداد سے ہی آگے بڑھا جاتا ہے۔ تم نے کماد لگایا ہے، ہم اوّل نمبر ریٹ دے کر اٹھائیں گے اور ادائیگی نقد۔ اور تمہیں کیا چاہیے؟ میں نہیں کہتا کہ یہ کرو اور وہ کرو۔ سچ پوچھو تو مجھے ان باتوں کی کوئی سمجھ ہی نہیں۔ تم تجربہ کار ہو، جو مناسب سمجھو کرو۔ مقصد یہ ہے کہ مِل چلتی رہے۔"

مل کا پہلا کرشر چلا تو وعدے کے مطابق ملک جہانگیر نے ایک کنال چھوڑ کر آٹھوں کے آٹھ ایکڑ گنا اٹھا لیا اور پیسے ایک مہینے کے وقفے پر ادا کر دیئے۔ ہمارے گھر میں پہلی بار اتنی نقدی آئی تھی۔ خوشی کے رنگ لالے اور بی بی کے چہروں سے ظاہر ہونے لگے تھے۔ لالے اور بی بی نے شلوار قمیضوں کے چھ چھ سات سات سوٹ بنوائے۔ مجھے بھی تین سوٹ ملے۔ بچونگڑوں کے لئے نئے کپڑے آئے۔ سب کے لئے ایک ایک جوڑا نئی چپلوں کا بنوایا گیا۔ اس کے علاوہ بی بی نے چاچے احمد کے سارے کنبے کو کپڑوں اور جوتوں کا ایک ایک جوڑا بھیجا۔ جب باسا نیا جوڑا اور پشاوری چپل پہن کر ملنے آیا تو اس کے پیر زمین پر نہ پڑتے تھے۔ میرا قد کاٹھ بھی نکل رہا تھا مگر باسا تو ایسا گبھرو جوان نکلا تھا کہ اس کا سر آسمان کو چھوتا ہوا معلوم ہوتا تھا گو اب بھی میری نظر غیر ارادی طور پہ کم از کم ایک بار اس کی ٹانگوں کے بیچ چلی جاتی تھی اور اس کا ڈیل ڈول دیکھ کر دل میں حیرت انگیز خیالات آیا کرتے تھے۔ گاؤں کے درزی اور موچی کی نظر میں تو ہماری قدر و قیمت بڑھ ہی گئی تھی، دوسرے لوگوں کے رویئے میں بھی احترام کی جھلک آگئی تھی۔ یہاں تک کہ کئی لوگ اب مجھ کو بھی سرفراز کی بجائے بے تکلفی سے "چوہدری" کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے۔ کبھی کبھی جب بی بی بر سبیل تذکرہ کہتی کہ یہ سب ملک جہانگیر کی مہربانی کی بدولت ہوا ہے تو لالہ خفا ہو کر کہتا، "مہربانی کیسی؟ کیا گنا اس نے بیجا تھا، جان توڑ محنت اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے کی تھی؟ ہمارا گنا پُوری تحصیل میں اوّل نمبر ہے۔ گُڑ نہیں دیکھا، رَوہ پانچ مِنٹ بھی نہیں اُبلتی اَور کڑاہ کے اَندر جمنے لگتی ہے۔ مہربانی! مہربانی تو مَیں اُس کے ساتھ کر رہا ہُوں۔ دو جھگڑے اب تک نبٹا چُکا ہوں، ورنہ نہ ہِل چلتی نہ قِصّہ شُروع ہوتا۔ مزدُور بچارے اچھے ہیں، ابھی تک میری عِزّت رکھ رہے ہیں۔"

"اپنا ہی بھلا کر رہے ہو،" بی بی جواب دیتی۔ "نہ ہِل چلتی نہ کماد کا مُول پڑتا۔ گُڑ پکا پکا کر ہاتھ میں کیا آتا تھا؟ اُوپر سے چوبیس سیر چینی رعایتی بھاؤ پہ ملی وہ الگ۔"

"گُڑ پکا کر ہمارا گزُارہ تو ہو جاتا،" لالہ کہتا، "مگر ہِل نہ چلتی تو جہانگیر کا کباڑا ہو جاتا۔"

"اوّل نمبر کماد کا بیج تو ابے نے ہی لا کر دیا تھا نا" بی بی جواب دیتی۔ مَیں نے محسُوس کیا تھا کہ اوجھری والی رات کے بعد جب لالے اَور بی بی کا سلوک بحال ہوا تھا اُس وقت سے بی بی ہر غلط سلط بات پر اَپنی ٹانگ اُوپر رکھنے کی کوشش کرتی تھی، اَور لالہ آخر میں چُپ ہو رہتا تھا۔ مجُھے خیال آتا تھا کہ لالے کے دِل میں کوئی گناہ گاری تھی جِس کا بی بی کو پتا چل گیا تھا اور وہ اُس کا فائیدہ اُٹھا رہی تھی۔ اگلا سال سارے کا سارا اچھا گزُرا تھا، سوائے آخر کے دو مہینوں کے۔ مَیں نے دسویں کے اِمتحان کے لِئے دِل لگا کر محنت کی تھی۔ لالے نے بیج کے لِئے ایک کنال کماد کھڑا رکھ لیا تھا۔ اگلے سال ہم نے دس ایکڑ کماد بیجا اَور صِرف دو ڈھائی ایکڑ گھر کی گندم کے واسطے رکھ لئے۔ بیج والے کنال میں سے بی بی نے زور لگا کر دو چار مرلے کماد کا گُڑ پکوا لیا تھا۔ کتنی دیر ہو گئی مجُھے تازہ گُڑ کھائے ہُوئے۔ دو سال! گرم گرم ادھ جمے گُڑ کو پگھلے ہُوئے مکھن میں ڈبو کر باجرے کی روٹی کے ساتھ کھانے کا مزا آج بھی میری زُبان پر ہے، گویا ابھی ابھی کھا کے بیٹھا ہُوں، گو دو سال سے میں نے نہیں چکھا۔ عجیب بات ہے۔ کیا سب لوگ میری طرح وقت کے اَندر آگے پیچھے پھرنے کی اہلیت رکھتے ہیں جیسے کہ گزُری ہُوئی عمُر، سامنے کی عمُر اَور آنے والی عمُر کی کوئی مقرر جائے مقام ہی نہیں؟ اِس سال کے آخر تک کی دو خُوش گوار باتیں مجُھے یاد ہیں۔ ایک خانیوال کا جلسہ تھا۔

"اپنا پیر اَندر رکھو،" جہانگیر نے لالے سے کہا تھا۔ "بڑا موقعہ ہے، بھاشانی کا جلسہ ہے۔ اِس میں شریک ہونا ضروری ہے۔ اَور کوشش کرو کہ اگر لیڈروں کے ساتھ نہیں تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سٹیج کے آس پاس دِکھائی دیتے رہو۔ ایسے چھوٹی سطح کے لوگوں پر اثر و رسُوخ قائم ہوتا ہے۔"

میرے اِمتحان ہو چکے تھے۔ زمین بھی اُس دوران میں فارغ تھی۔ میں نے لالے کے ساتھ جانے پہ اصرار کیا۔ لالہ مغل پورے کی ایک مزدُور یونین اَور کچُھ کِسان کمیٹیوں کے نمائندوں کے جتھے میں شامل تھا۔ ہم بس پر سوار ہو کر خانیوال پہنچے تھے۔ اِتنا بڑا جلسہ مَیں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ پہلے پہل تو میرا جی گھبرانے لگا تھا مگر کچُھ ہی دیر کے بعد ہجوم کا خُوش مزاج جوش و خروش دیکھ کر مجُھے تسلی ہو گئی اَور جوں جوں وقت گزُرتا گیا میں مجمعے میں گھُلتا مِلتا گیا۔ بیسیوں ہی مختلف جھنڈے اَور بینر چھوٹے بڑے بانسوں پہ بندھے ہجوم کے سروں کے اُوپر اُوپر لہرا رہے تھے، زیادہ تر این۔ اے۔ پی۔ کے بینر تھے مگر کئی مختلف رنگوں اَور ڈیزائنوں کے کِسان اَور مزدُور تنظیموں کے کتبے اَور پرچم سارے میدان پر اَیسے پھڑپھڑا رہے تھے جیسے شادیوں کے موقع پر رنگ برنگی جھنڈیوں کی قطاریں۔ لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کے باوجُود مزید جلُوس آ آ کر شامل ہوتے جا رہے تھے۔ ہر ایک جلُوس کے ساتھ کم از کم ایک ڈھولچی ضرور ہوتا تھا، جس کی تھاپ پہ چند لوگ آگے آگے ناچتے ہُوئے ضرور آتے تھے۔ بہت بڑا سٹیج تھا جس پہ چالیس پچاس لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی، گو صِرف دس بارہ کرُسیاں رکھی تھیں۔ سٹیج کے ایک کونے پر ہاروں سے بھرا ہُوا ٹوکرا رکھا تھا۔ مائیکروفون پر ایک دس بارہ سال کا مزدُور لڑکا کھڑا پنجابی کی اِنقلابی نظم گا رہا تھا۔ بڑے بڑے لیڈروں کی آمد کی خبر تھی۔ بھنڈارہ صاحب، ملک صاحب، انصاری صاحب، شیخ صاحب، بنگش صاحب مگر سب سے زیادہ اِشتیاق مولانا بھاشانی کے بارے میں تھا۔ معلُوم ہوتا تھا کہ کِسی نے بھی اُن کو دیکھ نہ رکھا تھا۔ میرے خیال میں صرف ایک صُورت آتی تھی جِس کا چہرہ مہرہ غائب تھا، بس ایک لمبی چوڑی سفید داڑھی ہر جانب پھَیلی ہُوئی دِکھائی دیتی تھی کیونکہ ان کا نام مولانا تھا۔ میں نے کچُھ لوگوں کو چہ میگوئیاں کرتے ہُوئے سُنا کہ مولانا بھاشانی کمیونسٹ تھے۔

"لالہ، کمیونسٹ کیا ہوتے ہیں؟" مَیں نے پُوچھا۔

"رُوس اَور چین کے رہنے والوں کو کمیونسٹ کہتے ہیں،" لالے نے مختصراً جواب دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری تسلی نہ ہوئی۔ رُوس اَور چین کے رہنے والوں کو تو رُوسی اَور چینی کہتے ہیَں، میں نے سوچا۔ "لالہ،" میں نے پُوچھا۔ "مولانا بھاشانی کمیونسٹ ہیَں؟"

"نہیں نہیں،" لالہ سختی سے بولا، "خدمت خلق کرنے والے خُدا خوف آدمی ہیَں۔ بہت بڑے لیڈر ہیَں۔"

میرا ذہن مزید گڈمڈ ہو گیا۔ آج تک مجُھے کمیونسٹوں کے بارے میں پُورا عِلم حاصل نہیں ہو سکا۔ صِرف اِتنا مزید پتا چلا ہے کہ کمیونسٹ لامذہب ہوتے ہیَں۔ کئی بار ارادہ کیا ہے کہ کِسی عِلم والے سے دریافت کروں، مگر موقع ہی نہیں ملا۔ مَیں اِن بے علموں کے گروہ میں پھنس گیا ہُوں۔ یاروں کے یار ہیَں مگر ایک نمبر کے جاہل ہیَں۔ سارا سارا دِن اَور آدھی رات تک کھاتے اَور بک بک کرتے رہتے ہیَں اَور پھر بستر پر لمبے پڑ کر سو جاتے ہیَں۔ میرا خیال نہیں کہ اِن میں سے ایک بھی اِس دفعہ پاس ہو۔ ایک مَیں ہی ہُوں جسے نیند آتے آتے ہی آتی ہے۔ پچھلے سال ہمارے انگلش کے پروفیسر میر صاحب کے بارے میں بھی افواہ تھی کہ کمیونسٹ ہیَں۔ مگر مجُھے تو وہ بہت اچھے لگتے تھے، شیکسپیئر کا ڈرامہ کرانے کی تیاری کر رہے تھے۔ پھر اچانک اُن کی تبدیلی ہو گئی۔ کچُھ لوگ کہتے تھے اُنہیں نکال دیا گیا ہے۔ واللہ اعلم کیا قِصّہ تھا۔

"لالہ، وہ دو آدمی کہہ رہے تھے مولانا بھاشانی کمیونسٹ ہیَں۔" مَیں نے کہا۔

"جھوٹ بولتے ہیَں،" لالہ بولا، "افواہیں پھیلاتے ہیَں، اِنسان دوست ہونے سے بھلا کوئی کمیونسٹ ہو جاتا ہے؟"

سب سے پہلے پنجاب اَور سرحد کے لیڈر آئے۔ ملک صاحب اَور شیخ صاحب، بھٹی صاحب اَور کلو صاحب، خان صاحب اَور چنگیزی صاحب۔ یہ سب لیڈر اَپنے اپنے جلُوس لے کر آئے تھے۔ نعروں اَور ڈھولوں کے شور میں جیَسے جیَسے یہ لیڈر آتے گئے، نوکرے سے دو دو چار چار ہار اُٹھا کر اُن کے گلے میں، جو پہلے ہی ہاروں سے لدے تھے، پہنائے جاتے رہے۔ سٹیج پر چڑھتے ہی وہ دونوں بازُو ہوا میں بلند کر کے ہجوم کے نعروں کا جواب دیتے اَور کُرسیوں پر بیٹھ جاتے۔ پھر ایک دُوسرے کی جانب جھُک جھُک کر باتیں کرتے، لوگوں کی ریل پیل دیکھ کر خُوشی سے ہنستے، انتظامیہ کے چھوٹے موٹے لوگوں کے ساتھ غیر معمولی اِنکساری سے مصافحے کرتے، اَور کناتوں کے پچھلے دروازے کی جانب مُڑ مُڑ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دیکھتے۔ مجمعے میں ہلچل تھی۔ لوگ نعرے لگا لگا کر تھک جاتے تو ایک جانب سے تالیوں کی لہر اُٹھتی اَور چشم زدن میں ایک سِرے سے دُوسرے سِرے تک پھیل جاتی۔ آخر جب بچوں کی نظموں اَور نوجوانوں کی اِکا دُکا تقریروں سے مجمعے کی بے تابی نہ سنبھلی تو دلدار بھٹی صاحب، جو علاقے کی کِسان تنظیم کے سیکرٹری تھے، اُٹھ کر مائیکروفون پر آئے۔ اُنہوں نے ہاتھ بلند کر کے مجمعے کو خاموش کرایا اَور اَپنی تقریر شُروع کی۔ لوگ تقریر سننے لگے۔ دلدار بھٹی صاحب اَپنی تقریروں کے لِئے مشہور تھے، مگر میری حالت مختلف تھی۔ یہ میرا پہلا جلسہ تھا۔ میرا دھیان تقریر کی بجائے دُوسری چیزوں پر تھا۔ مَیں الفاظ کی بجائے بولنے والے کی آواز کے زیروبم کو محسُوس کر رہا تھا۔ پھر میں مقرر کے بازوؤں، اِس کے سر، ہاتھوں، کندھوں اَور سارے جِسم کی جنبش کو دیکھ رہا تھا۔ ایک بار مجھے خیال آیا کہ اِس کی جگہ پر اگر میں کھڑا ہوں تو کیسا محسُوس کروں۔ پھر میں نے لوگوں کے بیکراں ہجوم پر نظر دوڑائی تو میرا دِل لرزنے لگا تھا۔ سٹیج کے عقب میں لیڈروں کے داخل ہونے کا جو رستہ تھا اِس پہ بھی میری نظر تھی۔ میں سرسید احمد خان کی تصویر سے واقف تھا۔ آسمان پہ اللہ تعالیٰ کی جو صورت میرے ذہن میں تھی وہ سرسید احمد خان سے ملتی جلتی تھی۔ اِس روز میں اللہ میاں اَور سرسید کے بیچ بیچ کی شکل والے مولانا بھاشانی کی آمد کا منتظر تھا۔ پھر ایک بار جو میرے کان تقریر کی جانب راغب ہُوئے تو میں سنتا ہی چلا گیا۔

"یہ کون لوگ ہیں---" دلدار بھٹی صاحب ہاتھ ہلا ہلا کر کہہ رہے تھے۔ "جو ہمارے علاقے کی متروکہ زمینوں پر آکر قابض ہو گئے ہیں؟ان ناجائز قبضہ جات کے ذمہ دار کون ہیں؟ میں آپ کو بتاتا ہُوں۔ اِس حق تلفی کے ذمہ دار وہ حکومتی کارندے ہیں جنہوں نے دُوسرے ضلعوں سے ہی نہیں بلکہ دُوسرے صوبوں سے لوگوں کو یہاں لاکر آباد کیا ہے جنہوں نے جڑانوالے کی جھیل چکو کی زرخیز--- زرخیز--- سونا اگلنے والی زمین بڑے بڑے استحصالی زمینداروں کو عنایت کی ہے لیکن جو محنت کش اَپنے خُون اَور پسینے سے یہ سونا اگاتے ہیں وہ کل بھی غریب کِسان اَور کھیت مزدُور تھے، آج بھی غریب کِسان اَور کھیت مزدُور ہیں۔ یہ حکومتی کارندے کون ہیں جنہوں نے جعلی مہاجروں کے لِئے قانُون بنائے ہیں جنہوں نے قانُون بنایا ہے کہ دلی اَور لکھنؤ کا رہنے والا صِرف ایک حلفیہ بیان دے کر چھتیس ہزار یونٹ الاٹ کرا سکتا ہے۔ میں پُوچھتا ہُوں کہ یہ پاکستان ہے یا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت ہے، جہاں نوکر جھوٹے سچے بیان دے کر مربعوں کے مالک بن گئے ہیں اور شرفاء جن کی حمیت ان کے آگے آنے میں مانع رہی ہے وہ نوکر بن چکے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اِس سرزمین کو ہمیشہ کے لِئے گندے خُون سے داغ دار کر دیا ہے۔ میں بتاتا ہُوں کہ یہ قانُون بنانے والے رنجیت سنگھ جیسے ان پڑھ نہیں ہیں، یہ دلی اور علی گڑھ کے گریجویٹ ہیں۔ یہ انہی انگریزوں کے کارندے ہیں جنہوں نے قوم کے غداروں کو بڑی بڑی جاگیریں دے کر سب سے پہلے اِس زمین پر داغ لگایا تھا۔ اب ان کی اولادیں امراء اور شرفاء کہلاتی ہیں۔ کوئی ان سے پُوچھنے والا نہیں کہ ان کی ملکیتوں کا منبع کہاں سے پھُوٹا تھا؟ اب انہی نام نہاد خان بہادروں اور نوابوں کے وارثوں نے اپنے حکومتی کارندوں کو پال کر اِس پاک سرزمین پر غداری کی مزید مہریں ثبت کر دی ہیں۔۔۔"

میں بھُونچکا کھڑا سُن رہا تھا۔ ان الفاظ نے میرے کانوں میں سنسناہٹ پیدا کر دی تھی۔ لالہ بھی گھر میں کبھی کبھی کِسی بات پر جوش میں آکر تقریر کے انداز میں بات کیا کرتا تھا مگر جو باتیں بھٹی صاحب کے مُنہ سے نِکل رہی تھیں وہ میں نے پہلی بار سنی تھیں۔

"بھٹی نر آدمی ہے۔" میرے ساتھ بیٹھے ہُوئے آدمی نے کہا۔ "بات کھلے عام کرتا ہے، اندر خانے کا آدمی نہیں ہے۔"

بھٹی صاحب سانس لینے کو رکے تو دُوسرے آدمی نے مُنہ کے آگے ہاتھ رکھ کر پھیپھڑوں کے پُورے زور سے بب بب بب با آہلا لالالا آ۔۔۔ کی جارحانہ آواز پیدا کی جو حملے اور فتح کی للکار تھی۔

پندرہ برس کی عُمر میں، میں نے کھلے عام ایسی باتیں سنی تھیں جن سے بغاوت کی بو آتی تھی اور جِن کا خیال کرکے ہی دِل ڈر جاتا تھا۔ اِس دِن پہلے پہل میرے ذہن میں غداری اور بغاوت کا رشتہ استوار ہوا تھا جیسے کہ یہ دونوں چیزیں آپس میں لازم و ملزوم ہُوں۔ صِرف ایک فرق تھا۔ مجُھے خبر نہیں کہ یہ دلدار بھٹی کی باتوں کا نتیجہ تھا یا کہ محض میری خام خیالی اِس میں کارفرما تھی مگر میرے دِل میں یقین پیدا ہو گیا تھا کہ بغاوت اور غداری دونوں کے وہی لوگ مرتکب ہُوئے تھے جِن کو دلدار بھٹی صاحب ملعُون کر رہے تھے۔ دلدار بھٹی صاحب کی باتیں میرے دِل کو ابھی لگنی شُروع ہی ہوئی تھیں کہ سٹیج کے پیچھے ہلچل پیدا ہوئی۔ کئی لوگ بھاگتے ہُوئے داخل ہُوئے۔ پھر مزید لوگ دُوسروں کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سامنے سے ہٹا کر رستہ صاف کرتے ہُوئے آئے۔ ان کے نرغے میں ایک چھدری داڑھی، سیاہ رنگت اَور بھاری جثے والے شخص نمودار ہُوئے۔ دلدار بھٹی نے مڑ کر دیکھا اَور گویا بیچ منجدھار اپنی تقریر روک کر بازو ہوا میں اُٹھا دیئے۔

"حضرت مولانا بھاشانی صاحب تشریف لے آئے ہیں۔" وہ بولے۔ "ان کے استقبال کے واسطے حاضرین کھڑے ہو جائیں۔" پھر دلدار بھٹی چیخ کر بولے۔ "مولانا بھاشانی!"

"زندہ باد!" جواب میں مجمع نے نعرہ لگایا۔

"ذرا زور سے۔" دلدار بھٹی دُہرا کر بولے۔ "مولانا بھاشانی!"

"زندہ باد!"

"غازیٔ بنگال!"

"زندہ باد!"

"مجاہدِ انسانیت!"

"زندہ باد!"

نعروں کے بیچ ٹوکرے کے باقی ماندہ ہار مولانا بھاشانی کو پہنا دیئے گئے۔ مولانا بھاشانی کو دیکھ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ میں نعروں کے جواب میں زندہ باد کی گردان کرتا رہا اَور دِل میں حیرت سے سوچتا رہا کہ کیا یہ مولانا بھاشانی ہیں؟ میرے ذہن سے سرسید احمد خان اَور اللہ میاں کی ملی جلی صورت آپ سے آپ غائب ہو گئی۔ اِس شخص کی ٹھوڑی پہ چند بال تھے جن میں تقریباً آدھے سفید اَور باقی کے مہندی لگے سُرخ رنگ کے تھے، جلد جلی ہوئی سیاہ جسم گٹھا ہُوا مضبوط اَور موٹا تھا۔ لباس کے نام کی ایک دھاری دار قمیض اَور ٹخنوں سے اُونچی ہلکی سی لُنگی تھی۔ پاؤں میں ہوائی چپل اَور ہاتھ میں لمبا سا لکڑی کا ڈنڈا تھا۔ پہلی نظر میں یہ آدمی حُلیئے سے کوئی کھیت مزدُور دِکھائی دیتا تھا جو ضعیف العمری کی وجہ سے کام ترک کر چُکا ہو۔ صِرف اِس کی چال ڈھال جو بھاری بھاری قدموں والی تھی اَور طور طریقہ جس سے وہ سٹیج پہ بیٹھے ہُوئے لوگوں سے ملا تھا، وہ مختلف تھے۔ ان میں ایک پُراعتماد سادگی تھی جس سے معلُوم ہوتا تھا کہ گویا ساری دُنیا اِس آدمی کی اَپنی ہی ملکیت میں تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سٹیج پہ بیٹھے ہُوئے سب لیڈر احتراماً جھُک جھُک کر مولانا بھاشانی سے ملے۔ مولانا بھاشانی نے سیدھا کھڑے کھڑے اپنا ہاتھ یُوں بے تکلفی سے آگے بڑھایا جیسے ہاتھ نہیں بلکہ اَپنے آپ کو پیش کر رہے ہُوں۔ ان کے اِس اَنداز سے میرے اَندر ایک لہر سی دوڑ گئی۔ پہلی بار مجُھے انسان کی غیر مرئی طاقت کا احساس ہُوا۔ میں سٹیج سے کچُھ فاصلے پہ کھڑا تھا۔ مولانا بھاشانی نے کُنگی اتنی اُونچی باندھ رکھی تھی کہ ٹخنوں سے اُوپر چھ چھ انگل ان کی سیاہ مگدروں کی سی پنڈلیاں دِکھائی دے رہی تھیں۔ مجُھے ایسے لگا جیسے وہ پنڈلیاں میری آنکھوں کے بالکل قریب آگئی ہیں اَور میں نے دیکھا کہ ان کی موٹی جلد پر تڑخنے کی وجہ سے سفید سفید باریک لکیروں کا جال بنا تھا۔ سٹیج کے درمیان والی کرسی پر بیٹھ کر اُنھوں نے نے ہاروں کی لڑیاں گلے سے اتار کر میز پر ڈھیر کر دیں اَور ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر ہجوم کے نعروں کا جواب دیا۔ اِس وقت میں نے یہ بھی محسُوس کیا کہ ایک آدمی کے ہاتھ اُٹھانے اَور دُوسرے آدمی کے ہاتھ اُٹھا کر جواب دینے میں کیا فرق تھا۔ ایک لیڈر ہاتھ اُٹھاتا تھا تو اَپنے آپ کو دِکھاتا ہُوا معلُوم ہوتا تھا، دُوسرا لیڈر ہاتھ بلند کرتا تھا تو یُوں لگتا تھا جیسے اَپنے سامنے کھڑے ہزاروں لوگوں کے وجُود کا اقرار کر رہا ہے۔ مولانا بھاشانی کے ہاتھ ایک ایک فرد کو چھُوتے ہُوئے معلُوم ہوتے تھے۔ خود میرے دِل کے اَندر اس لمس کو محسُوس کر کے اَیسا جوش اُبھرا کہ میں نے گلا پھاڑ کر اَپنے تئیں دِن بھر کا سب سے اُونچا نعرہ لگایا۔ میری آواز پھٹ گئی اَور مجُھے ایسا محسُوس ہوا جیسے میرے دِل کے گِرد ا گِرد ایک مضبوط حصار بندھ گیا ہو جو اسے ہر کِسی یلغار سے محفوظ رکھے گا۔ اب علاقے کے مقامی اَور ان کے بعد باہر سے آئے ہُوئے بڑے لیڈروں کی تقریریں شرُوع ہوئیں۔ دلدار بھٹی صاحب کی تقریر کے بعد میری توقعات تیز ہو چکی تھیں۔ ان کے الفاظ دِل میں خوف پیدا کرتے تھے مگر ساتھ ہی ایسے پُرکشش بھی تھے کہ مزید سننے کو جی کرتا تھا مگر بعد میں آنے والے لیڈروں کی تقریریں سُن کر میں مایوس ہوتا گیا۔ ان کے الفاظ میں نہ بھٹی صاحب کے لہجے کی کاٹ تھی نہ ان کے الفاظ کی خطرناک للکار۔ یہ لیڈر بول تو جوش سے رہے تھے مگر دھیمے، مہذب اَنداز میں غریبوں اَور محنت کشوں کے حقوق، جمہوریت اَور دیگر موضوعات پر بات کر رہے تھے جیسے جیسے وقت گزُرتا گیا ان کی باتوں میں میری دلچسپی ختم ہوتی گئی۔ میں نے غیر ارادی طور پہ سننا ترک کر دیا یہاں تک کہ بیچ بیچ کے نعروں کے جواب میں بھی میں محض ہونٹ ہلانے پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اکتفا کرنے لگا۔ میری تمام تر توجہ مولانا بھاشانی پر مرکوز تھی جو کرسی پہ سیدھی پُشت سے بیٹھے بغور دُوسروں کی تقریریں سُن رہے تھے۔ کِسی نے ان کے ہاتھ میں این۔ اے۔ پی کا جھنڈا پکڑا دیا تھا جِسے کچھ دیر تک تو وہ پکڑے بیٹھے رہے پھر مفلر کی طرح گلے کے گِرد لپیٹ لیا۔ لوگ تقریر کرنے والے کی بات کاٹ کر نعرے لگانے لگے جِن کے جواب میں مولانا بھاشانی نے ہنس ہنس کر ہاتھ ہوا میں لہرائے۔

آخر میں جب مولانا بھاشانی کی اپنی باری آئی تو نعروں، تالیوں اَور ڈھولوں کے شور میں وہ اُٹھ کر مائیکروفون پر آئے۔ اشتیاق سے میرا دِل دھک دھک کرنے لگا۔ مُجھے خیال آیا کہ ابھی اُن کے مُنہ سے شیر کی دھاڑ کی سی آواز بر آمد ہو گی اَور تلوار کی دھار کے سے لہجے میں اُن کے الفاظ سینوں کو چیر کر دلوں میں اُترتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ لوگوں کے ذہن سے دِلدار بھٹی کی آواز محو ہو جائے گی۔ اُس لمحے میں مجھے یہ علم نہ تھا کہ مجھ کو پہلے سے بھی بڑھ کر مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جیسے ہی اُنہوں نے بولنے کے لِئے مُنہ کھولا اُن کے حلق سے پتلی سی چیختی ہُوئی آواز نِکلی۔ نہ شیر کی دھاڑ کا سا لہجہ، نہ ہی باربط الفاظ۔ وہ کوئی عجیب سی ملی جلی زبان بول رہے تھے۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ بیچ بیچ میں کوئی لفظ یا جملہ سمجھ میں آ رہا تھا۔ اِتنے میں ہماری جانب کا لاؤڈ سپیکر بند ہوگیا، جس سے آواز بالکل ہی رک گئی۔ اُس کے بعد میرا دھیان اُن کی تقریر سے ہٹ کر اُن کے وجود پر جا اٹکا۔ گفتار کی دقّتوں کے باوجود، اُن کے اَنداز کا سحر اُسی طرح قائم تھا۔ اُن کے چہرے، ہاتھوں، بازوؤں اَور کندھوں کی حرکات میں ایک سادہ سی توانائی اور خُود مختاری تھی جو یک بارگی چونکا دینے کی بجائے غیر محسوس طور پہ دِلوں میں اثر کرتی تھی۔ اِس بات کا مکمل احساس اُس وقت ہوا جب اچانک میری توجہ اپنے اردگرد پہ گئی۔ اتنے بڑے مجمعے پر خاموشی طاری تھی۔ لوگ خلافِ معمول، مولانا بھاشانی کی بات کے بیچ نعرے لگانے سے بھی رُکے ہُوئے تھے۔ اُن کی سمجھ میں کوئی بات آ رہی تھی یا نہیں۔ اِس سے اُنہیں کوئی غرض نہ تھی ——— ہم سب ہمہ تن گوش ہو کر اُس شخص کی آواز کو سن رہے تھے جس کے گرد آلود سیاہ پیر اَور موٹی پنڈلیاں سٹیج کے فرش میں مضبوط کلوں کی مانند گڑی تھیں، اَور جس کا وجود ایک ایسے شجر کی مانند تھا جِس پہ کئی جانداروں کا اِنحصار ہوتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ہجوم کی دھکم پیل میں لالے سے بچھڑ چکا تھا۔ جلسے کے خاتمے پر اُسے تلاش کرنے میں مجھے کچھ وقت لگا۔ لالے کا مزاج بگڑا ہوا تھا۔

"تو نے میرا ہاتھ کیوں چھوڑ دیا تھا؟" وہ خفگی سے بولا۔

"لالہ، اِتنے دھکے لگ رہے تھے۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں وہاں سے چل پڑے۔

"لالہ،" کچھ دیر کے بعد میں نے پوچھا، "تم کہاں بیٹھے تھے؟"

"میں آگے سٹیج کے پاس بیٹھا تھا۔"

"لالہ، تم نے مولانا بھاشانی کی پنڈلیاں دیکھی تھیں؟"

"ہاں،" لالے نے کہا۔ "کیوں، پنڈلیوں کی کیا بات ہے؟"

"اُن کی جلد تڑخی ہوئی تھی۔"

"میں نے غور نہیں کیا،" لالے نے کہا۔

"اُس پہ باریک باریک لکیروں کا جال سا بنا ہوا تھا،" میں نے کہا۔

"تم بھی عجیب عجیب چیزیں دیکھتے رہتے ہو،" لالہ بولا۔

مجھے یقین آ گیا کہ سٹیج کے اِتنا نزدیک ہونے کے باوجود لالے کو وہ لکیریں نظر نہیں آئی تھیں۔ یہ سوچ کر کہ میرے قبضے میں ایک ایسی چیز ہے جو لالے کے پاس نہیں ہے، میں دِل میں خوش ہوا۔ جب ہم واپسی کی بس پر سوار ہوئے تو میں نے پوچھا، "لالہ، مولانا بھاشانی کیا کہہ رہے تھے؟"

"کہہ رہے تھے کِسانوں، مزدُوروں، غریب لوگوں کو اُن کا حق ملنا چاہیے۔"

"ملتا تو ہے،" میں نے کہا۔

"محنت کر کے روزی کمانے والے کو کبھی پورا حق نہیں ملتا،" لالے نے جواب دیا۔

"جو لوگ ہماری زمینوں پر بیجائی، کٹائی کا کام کرتے ہیں اُن کو ہم حصہ نہیں دیتے؟"

لالے نے عجیب طرح سے میری جانب دیکھا۔ اُس کی پیشانی پر سوچ کا ایک بل نمودار ہوا۔ "بھئی، سوال مختانے کا نہیں،" لالے نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "اصل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

معاملہ بڑے زمینداروں اُور بے زمین کِسانوں کا ہے۔ جاگیرداروں کے پاس ضرورت سے زیادہ زمین ہے۔ دوسری طرف ضرورت سے زیادہ اَیسے لوگ ہیں جن کی ملکیت میں ایک انچ زمین بھی نہیں۔ یہ لوگ مالکوں کی زمین پر محنت ہی نہیں کرتے بلکہ اُن کی زر خرید غلامی کرتے ہیں۔ جاگیردار اُن کو اپنی رعایا کے نام سے پکارتے ہیں اَور اپنے مویشیوں کا سابیگار کا کام اُن سے لیتے ہیں۔"

"جیسے ملک جہانگیر ہے؟" میں نے پوچھا۔

لالہ جواب دیتے دیتے ایک لحظے کو رُک گیا۔ مجُھے فوراً ہی اپنے سوال پر پشیمانی کا احساس ہوا۔ مجُھے علم تھا کہ لالہ کے ملک جہانگیر کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ ملک جہانگیر نے ہماری فصل اُٹھائی تھی اَور لالے کی جیب میں پیسے آئے تھے۔

"ملک جہانگیر اِتنا بڑا جاگیردار نہیں،" لالہ بولا۔ "تھوڑا بہت روشن خیال بھی ہے۔ اُس سے بہت بڑے بڑے مالکان ہیں جنھوں نے اپنی ریاستیں بنا رکھی ہیں، جو اپنی کُل اراضی کا دسواں حصہ بھی زیرِ کاشت نہیں لاتے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اُن کی اُسی کاشت سے عیش کی زندگی بسر ہو جاتی ہے۔ تجُھے پتا ہے کہ ہمارے ملک میں اَیسے اَیسے زمیندار ہیں جن کی زمین سینکڑوں مُربعوں پر پھیلی ہُوئی ہے؟"

"سیں---- کڑوں---- مرب---- بے؟ میں نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"ہاں ہاں۔"

میں سینکڑوں مُربعوں کو اپنے تصور میں بھی نہ لا سکتا تھا۔ وَیسے بھی میری دلچسپی اِس گفتگو میں اب ختم ہوتی جا رہی تھی۔

"لالہ،" میں نے کہا، "مجھے تو دِلدار بھٹی صاحب کی تقریر کا مزا آیا تھا۔"

"ہاں،" لالہ ہنس کر بولا، "دِلدار اِنقلابی آدمی ہے۔ مگر ایسے لوگوں سے اُن کے اپنے آدمی ہی متوشش ہوتے ہیں۔"

"لالہ متوشش کیا ہوتا ہے؟"

"واہ،" لالہ بولا، "اِس سال وظیفے کی اُمید لگا کے بیٹھے ہو اَور متوشش کے معنی نہیں جانتے۔ متوشش وہ شخص ہوتا ہے جِسے تشویش لاحق ہو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے پوچھنا چاہا کہ دِلدار بھٹی کے بارے میں اُن کے دوست کیسے متوشش ہو سکتے تھے۔ مگر میرا دِل اب ان باتوں سے اُٹھ گیا تھا۔ میرے دِل میں اُس جلسے کے بارے میں اب صِرف دو ہی عکس باقی رہ گئے تھے۔۔۔۔۔۔ ایک دلدار بھٹی کی شعلے کی مانند لپکتی ہوئی تقریر، اَور دُوسرا مولانا بھاشانی کا مینار کا سا بُت۔

نتیجہ نِکلا تو صِرف تین نمبروں کی گنجائش سے میرا وظیفہ لگ گیا۔ محنت بار آور ہوئی۔ بی بی نے شکرانے کے نفل ادا کئے۔ لالے نے گڑ والے چاولوں کی دیگ پکوا کے بانٹی۔ میرے پیر زمین پہ نہ ٹکتے تھے۔ لالے نے پکا ارادہ کر رکھا تھا کہ وظیفہ لگے نہ لگے، میری تعلیم جاری رہے گی۔ ہمارے گاؤں کے اَندر، لالے کے بعد میں پہلا لڑکا تھا جو شہر کے کالج میں پڑھائی کرنے کی غرض سے جا رہا تھا۔ اس بات کا سب کو پتا تھا کہ لالہ جو ارادہ کر لیتا تھا، دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے مگر وہ اپنے قول سے نہ ٹلتا تھا۔ لالہ نتیجہ نِکلنے سے پہلے ہی دو کالجوں سے داخلے کے فارم حاصل کر چُکا تھا۔ وظیفہ لگنے کے بعد اب میرے واسطے کِسی بھی کالج میں داخلہ لینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ یہ ایک اَیسا وقت تھا کہ میری دنیا کے بدلنے کا اِمکان میری آنکھوں کے سامنے لہرا رہا تھا۔ اِس موقعہ پر ملک جہانگیر نے ہمارے اَوپر اپنا وار کیا۔

ملک جہانگیر کی شوگر مل کو چالو ہُوئے چودہ پندرہ ماہ ہو چکے تھے، جس کے دَوران متعدد بار لیبر کے جھگڑے اٹھے تھے جن کو لالے نے اپنے تعلق واسطے سے ٹھنڈا کر دیا تھا۔

"ملک جہانگیر مجھ سے خطرناک کھیل کھلا رہا ہے،" ایک بار لالے نے گھر میں بات کی تھی۔ "میرے اُوپر ناجائز بوجھ ڈالتا جا رہا ہے۔"

"اپنی برادری ہے،" بی بی بولی تھی، "کُچھ ہم اُس کے کام آئیں، کُچھ وہ ہمارے کام آئے، دنیا کے کاروبار اِسی طرح چلتے ہیں۔ ہمارے حق میں اچھا ہے، خوشی غمی میں شریک ہوتا ہے۔"

"اپنے مطلب کے لِئے کرتا ہے،" لالے نے کہا تھا، "مل لگنے سے پہلے ہم کہیں اور رہتے تھے؟ تب وہ کہاں تھا؟ تجھے ان باتوں کا پتا نہیں سکینہ، مزدُور ایک سادہ اَور غریب طبقہ ہے۔ اُن کا اعتبار ایک بار کِسی سے اُٹھ جائے تو پھِر چاہے اُلٹے لٹک جاؤ وہ کِسی بات کے پھیر میں نہیں آتے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بس آنکھیں کھول کر چلو، سب کام دُرست ہو جائے گا" بی بی نے کہا۔

لالے کے چہرے پر تفکر تھا۔ مہینے میں ایک آدھ بار ملک جہانگیر اپنا آدمی بھیج کر لالے کو بلا لیا کرتا تھا۔ ہر بار جو لالہ وہاں سے لوٹتا تو پہلے سے زیادہ فکرمند ہوتا تھا۔ جس روز وہ آخری بار وہاں گیا تو مل میں بہت بڑی گڑبڑ ہُوئی تھی۔ لالے کی واپسی سے پہلے ہی گاؤں میں خبر پہنچ چکی تھی کہ مزدُوروں کے ہجُوم پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا اَور کچھ مزدُور زخمی ہو گئے تھے۔ ہمارے گھر میں عباس خبر لے کر پہنچا تھا۔ بی بی کبھی اَندر جاتی کبھی باہر، کبھی بیٹھتی کبھی اُٹھ کھڑی ہوتی۔

"اللہ کرے جھوٹ ہو،" وہ بار بار کہتی۔ "باسے، تیری خبر جھوٹ نِکلی تو چمڑی اُدھیڑ دوں گی۔"

"بی بی، مولا جھیور اُدھر سے خُود بھاگ کر آیا ہے۔"

"کون مولا جھیور، خیراں ملنگنی کا کھسم؟"

"ہاں۔"

"تو اُس کی بات پر اِعتبار کر کے بیٹھا ہے؟ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے جھوٹ بولتا ہُوا نِکلا تھا۔ میں کیا اُس کو جانتی نہیں؟"

"بی بی، وہ قرآن کی قسم کھا کر کہتا ہے،" عباس نے کہا۔

"اللہ تیرے لالے کو خیر خیر سے گھر لائے۔ ہم یہ کِس بکھیڑے میں پھنس گئے ہیں۔ گڑ کھا لیں گے، یا اللہ ہمارے دِلوں سے لالچ کو نکال۔ مل کیا لگی ہے ہمارے اُوپر آفت آ گئی ہے۔ پہلے بھٹے کے جھگڑے سے چھُڑا کر کھیتی پہ لگایا۔ اب یہ اللہ ماری مل لگ گئی ہے۔ ملک جہنگیر اللہ تجھے ہدایت دے۔" بی بی اپنے آپ سے باتیں کرتی ہُوئی اندر باہر آتی جاتی رہی۔

لالہ گھر آیا تو اُس کا چہرہ اُترا ہُوا تھا۔

"اللہ خیر، اللہ خیر" بی بی بھاگ کر اُٹھی اَور لالے کے بازوؤں، کندھوں اَور ہاتھوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگی۔ "خیر ہے ناء؟ چوٹ تو نہیں آئی؟"

لالے نے آہستگی سے جھٹک کر اپنا بدن اُس کے ہاتھوں سے الگ کیا اَور چپکے سے جا کر چارپائی پہ بیٹھ گیا۔